تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت مقداد ابنِ اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تقریریں کیں۔ آخر الذکر نے تو یہ کہا "حضورؐ ہمیں حضرت موسےٰؑ کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ط "موسیٰؑ تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں" آپؐ بسم اللہ کیجیے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائے۔ لیکن حضورؐ پھر بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔ آپؐ کی نگاہیں بار بار انصارؓ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔۔۔ اس لیے کہ تین سو تیرہ میں ساٹھ یا ستر اسی مہاجرینؓ تھے اور باقی تعداد انصارؓ کی تھی۔ پھر شاید بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ بھی حضورؐ کے پیشِ نظر ہوں۔ جس کی رُو سے انصارؓ صرف مدینہ پر حملہ کی صورت میں مہاجرینؓ کے دوش بدوش لڑنے کے پابند تھے۔۔۔ اب انصارؓ کے سردار حضرت سعدؓ کو خیال آیا کہ حضورؐ کا رُوئے سخن ہماری طرف ہے۔۔۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعد تھے! سعدؓ ابنِ معاذ رئیس قبیلہ اوس یا سعدؓ ابنِ عبادہ رئیس قبیلہ خزرج۔۔۔! میرا رجحان یہ ہے کہ یہ رئیس خزرج تھے۔ چونکہ ان کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا زیادہ تھا۔ گویا انؓ کو پورے انصارؓ کی قیادت حاصل تھی۔۔۔ لہٰذا انہوں نے کھڑے ہو کر تقریر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"حضورؐ شاید آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے! بھول جائیے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت کیا طے ہوا تھا! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ ۔ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ جب ہم نے آپؐ کو اللہ کا رسول مان لیا ہے تو اب ہمارے پاس اختیار کون سا رہ گیا! حضورؐ! آپؐ جو حکم دیں گے اُسے ہم بسر و چشم بجالائیں گے (سِرْ بِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ) اے اللہ کے رسولؐ لے چلیے ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم، اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے

(باقی صفحہ ۳ پر)

دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر (۲)

اسلام برّصغیر پاک و ہند میں

ڈاکٹر اسرار احمد

© rasailojaraid.com

id.com

- وروِدِ اوّل : سندھ میں
- ورودِ ثانی : شمال مغرب سے
- ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج لیکن اسلام کے زوال کی انتہا : اکبر اعظم علیہ ما علیہ
- الفِ ثانی کا تجدیدی کارنامہ :
  - شیخ احمد سرہندیؒ
  - شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ
  - امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ

id.com

برِصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اوّلاً عینِ عرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اَسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منور کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علیٰ النّاس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[3] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشّح عرب تاجروں

---

[1] آنحضورؐ کا سنِ وفات ۶۳۲ھ ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔

[2] بقول علامہ اقبال ؎ شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

[3] رستم، سپہ سالارِ افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے، ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!"

© rasailojaraid.com

کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ـــــــ لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی درّوں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیت واقعۃً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دَورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جذر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے غدر پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اول کے دَوران ۔ یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل غلام[۱] بادشاہ تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان (خلجی، لودھی وغیرہ) حکمران رہے' اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دَور ہے جس کے کل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس[۲] اُن کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"!)

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃِ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دو چار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو

---

[۱] تاریخ اسلام کا یہ دَورِ عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!

[۲] یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات تک!

چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا[1] اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار بھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ——— اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دُوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلالؐ و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ——— اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، احبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[2] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دُنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں[3] :

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

——— اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی

---

[1] چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتلِ عام ہوا کہ الامان والحفیظ ——— اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِعام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جاتا ہے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے :

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں | بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک | سر بروں آر و قیامت در میانِ خلق بیں

[2] شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود | فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

[3] گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ

ہے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ | خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابقِ واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی بالخصوص تاریخ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی!

[4] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں :

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری | اے کُشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری

© rasailojaraid

بادشاہ (EXEPTIONAL) ایسے درویش محمودؒ اور ناصر الدّین ایوبیؒ شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامع سیف و قلم شخصیّت' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب مسلمان حکمران و سلاطین اکثر و بیشتر " آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ[1] " کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریّت بھی آیاتِ قرآنی: " لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ " (المائدہ: ۶۳) اور " اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ " (توبہ: ۳۴) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَاہ وَیَااَسَفَاہ

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف و سناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس و قلم جدا، اور زیبِ منبر و محراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ و قتال اور' چنانچہ ابتدا میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمّد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی انتھک کوششیں' اور بعد میں ایک طرف قطب الدّین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگان سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلّق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOLS) ہے سلطان التمش کی جامع الصّفات شخصیّت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور صد درجہ عابد و زاہد انسان بھی ——— یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوئے

---

[1] علّامہ اقبالؒ مرحوم نے الفاظِ قرآنی " اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً " (سورۃ النمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک ——— سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر ——— پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز ——— دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ——— حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

aid.com

اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیّت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنّتیں چھوٹی ہوں نتیجتہً مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تأمّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گذرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید براں، ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراء النّہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علمِ کلام کا دَور دَورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجُود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیّت اور دوسرے وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتداء ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدُود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیث الرّسُولؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سُلطان غیاث الدّین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور انہوں نے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّین نے ایک حدیث رسولؐ

© rasailojaraid

کو تو بلا کسی جھجک اور تأمل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ :

"تو مقلد ابو حنیفہ ہستی. ترا با حدیث رسولؐ چہ کار؟ قولِ ابی حنیفہ بیار!"

تم مقلدِ ابو حنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمہیں حدیثِ رسولؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام ابو حنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو!

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اُٹھ گئے کہ :

"سبحان اللہ! کہ با وجود قولِ مصطفویؐ، از من قولِ ابی حنیفہؒ می خواہند!" (سیر العارفین)

سبحان اللہ! نبی اکرمؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابو حنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر! اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور اُمراء و عمایدِ سلطنت کی تھی اور اُن کے ساتھ بطورِ تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمّہ و خطباء، مدرّسین و معلّمین اور مفتی و قاضی حضرات' اور اس دُنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کُل دین کی حیثیّت حاصل تھی! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشدّدانہ ظاہر پرستی اور قانونی مُوشگافی کا دَور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف تصوّف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوتے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطّاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا! ان تمام سلاسل میں وحدت الوجُود کو گویا اصُولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے زیرِ اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیّت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قویٰ مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دُور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ——— باطنی احوال و کوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیّت

ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و
ت کی مستی میں پابندیِ شریعت اور اتباعِ سنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے
م یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر
نے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام
م" پر عمل عام ہو گیا تھا۔ نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت
ک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بغض اور عداوت
ں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش
علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک بُعدِ رابع (FORTH DIMENSION)
ضافہ ہو گیا۔ اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیّت کی درآمد سے جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا
ں کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آ گیا!

مسلم انڈیا کا سنہرا دور بلا شبہ اس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دورِ خاندانِ غلاماں، جس میں
ت، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزل و انحطاط کے آثار
یاں ہوئے تھے نہ باہمی بغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و
دن موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آ جاتی ہیں لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا
ال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا
گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں ـــــــ تا آنکہ مغل اعظم شہنشاہ
ر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی
نظہ ہو کہ عین اس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر
ت رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک
م نہاد "دینِ الٰہی" نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اسے
رمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل
ن کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مد کے آثار جنم لیتے ہیں

© rasailojaraid.c

ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سرزمین پاک وہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بن گیا۔ بقول علامہ اقبال ؎

خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغل اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع ومشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب وتاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا[1] تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال وانحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت سرزمین ہند میں دو خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے: ایک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ ومجددانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اول وآخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو گئی۔

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدد کی مساعی میں پُرجوش مجددانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرت مجدد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمین ہند میں علم حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرت محدث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُور رس ثابت ہوئے۔

حضرت مجددؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیح عقائد، ردِّ بدعات، التزام شریعت اور اتباع سنت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی ونظری اور اعتقادی وعملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور رہا ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے

---

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہو گیا

تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی "طریقت" اور "شریعت" کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفہ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدِّ باب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ نتیجۃً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی۔ عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی ازسرِ نو بیدار ہوا۔ فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا اور جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوتے —— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّت اسلامیہ کا جُداگانہ تشخّص ازسرِ نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیّت حاصل ہے دینِ محمّدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علّامہ اقبالؔ مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخ مجدّدؒ کی لحد پر وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے جس کے نفَسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اقرب الی الشّریعت ہے۔ اور حضرت مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشّان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجدّدؒ کے احفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی ازسرِ نو

© rasailojaraid.com

تازہ کیا گویا ع "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!" (سرمد)

بایں ہمہ حضرت مجددؒ کے یہاں بھی حنفیت میں غلوّ اسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرت مجددؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دَورِ غلاماں میں) اس کا آغاز ہوا تھا لیکن ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدّثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرت مجددؒ ہی کی شخصیت کا ظلّ معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہ ہی کے مرید بھی لیکن اس کے باوجود کہ انہیں بھی وحدتُ الوجود سے بُعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے۔ اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً انہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کے بین بین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدّثؒ نے دین کا تعلق اُس 'اصلِ ثابت' کی 'فرعِ اوّل' کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدّمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرت محدّث کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے۔ کہ انہوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انہوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اشعۃ اللمعات) فارسی

com

میں تحریر کی، علاوہ ازیں اسنادِ حدیث اور اسماء الرّجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدمے کے ذریعے بھی عُلومِ حدیث کا ایک جامع تعارف کرا دیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیّتِ کُبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دَورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انہوں نے حضرتِ مجدّدؒ اور شیخ محدّثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیّت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدّدؒ نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو از سرِ نو ایک مستحکم داخلی تشخّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر اُمّت کے خلاف اُٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرت مجدّدؒ نے "ردِ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخ محدّثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمین ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیث نبوی کا ایک عظیم الشّان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اسی طرح امام الہندؒ نے مؤطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفّٰی)، واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذیل میں اصلِ اوّل کی حیثیّت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی

© rasailojaraid.c